# انتباہ المؤمنین

از قلم:

حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ

مترجم:

شہید اسلام مولانا یوسف لدھیانویؒ

# اِبتلاءُ المُؤمنین

# ایک شیعی مغالطے کا حل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد:

مشکوۃ شریف ص۵٦۷ باب مناقب العشرہ فصل ثالث میں مسند احمد کے حوالے سے درج ذیل حدیث منقول ہے:۔

عن علي رضى الله تعالى عنه قال قيل يا رسول الله! من نؤمر بعدك؟ قال إن تؤمروا أبا بكر تجدوه أمينا زاهدا في الدنيا راغبا في الآخرة، وإن تؤمروا عمر تجدوه قويا أمينا لا يخاف في الله لومة لائم، وإن تؤمروا عليا —ولا أراكم فاعلين— تجدوه هاديا مهديا يأخذ بكم الطريق المستقيم. (رواه أحمد)

"حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا' یارسول اللہ! آپؐ کے بعد ہم کس کو امیر بنائیں؟ فرمایا' اگر ابوبکر کو امیر بناؤ گے تو ان کو امین' دنیا سے بے رغبت اور آخرت کی رغبت رکھنے والے پاؤ گے' اور اگر عمر کو امیر بناؤ گے تو ان کو ایسا قوی امانت دار پاؤ گے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے' اور اگر علی کو امیر بناؤ گے...... اور میں تم کو نہیں دیکھتا کہ تم ایسا کرو گے...... تو ان کو ہدایت کرنے والا ہدایت یافتہ پاؤ گے کہ تم کو سیدھے راستہ پر لے چلیں گے۔"

کسی شیعہ نے اعتراض کے طور پر اس حدیث پاک کے معنی جناب مولانا الٰہی بخشؒ سے دریافت کئے۔ غالباً اعتراض یہ ہو گا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے، مگر صحابہؓ سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ان کو خلیفہ بنائیں گے۔ مولانا الٰہی بخشؒ موصوف نے یہ سوال حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ، بانی دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں بھیج دیا۔ پیش نظر رسالہ "انتباہ المومنین" حضرت نانوتویؒ کی جانب سے اس سوال کا جواب ہے، جس میں اس حدیث کی شرح میں ایسے علوم و معارف بیان فرمائے گئے ہیں جو صدیقین کے قلوب پر بطور علم لدنی القاء ہوا کرتے ہیں۔ یہ رسالہ جناب مولانا حبیب الرحمان (سابق) نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے صاحبزادہ گرامی جناب مولانا عبدالرحمان مرحوم کی فرمائش پر شائع کیا تھا۔ شاید اس کی دوبارہ طباعت نہیں ہوئی۔ چالیس برس پہلے اس رسالہ کی زیارت ہوئی تو بے ساختہ جی چاہا کہ اس گنجینہ معارف کو اردو میں منتقل کردیا جائے، لیکن اس خیال سے کہ اپنی کم سوادی و نافہمی کی وجہ سے اصل مطلب ہی خبط نہ ہوجائے، اس کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ یہ خیال ترجمہ سے دامن کشاں رہا، بعد میں یہ رسالہ کسی صاحب نے لے کر واپس نہیں لوٹایا۔ ایک طویل عرصہ کے بعد اس رسالہ کا دوسرا نسخہ میسر آیا تو ترجمہ کا ولولہ پھر تازہ ہوا، اور تحریف مطالب سے بچنے کی یہ تدبیر سمجھ میں آئی کہ ترجمہ کو اصل متن کے ساتھ شائع کیا جائے تاکہ اگر کہیں ترجمانی میں گڑبڑ ہوجائے تو اہل علم اصل متن سے مقابلہ کرکے اس کی اصلاح فرمادیں۔ چنانچہ یہ بضاعت مزجاۃ قدر شناسان علوم قاسمی کی خدمت میں بطور ارمغان پیش کرتے ہوئے دست بدعا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہ محض اپنے لطف و احسان سے اس ناچیز خدمت کو قبول فرماکر اسے اپنے بندوں کے لئے نافع بنائیں اور اس ناکارہ و نابکار کے لئے اپنی رحمت و مغفرت اور اپنے مقبول بندوں کی معیت کا ذریعہ بنائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

چونکہ اردو ترجمہ اور فارسی متن دونوں کو یکجا (مگر الگ الگ) شائع کیا جارہا

ہے' اس لئے متن اور ترجمہ کے درمیان تطبیق کی سہولت کے لئے رسالہ کو فقروں پر تقسیم کردیا گیا ہے' تاکہ اردو ترجمہ کے جس فقرہ کا متن دیکھنا ہو' آسانی سے اسکی طرف رجوع کیا جاسکے۔ رسالہ میں جو چند آیات واحادیث آئی تھیں ان کی تخریج بھی کردی گئی ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وأصحابہ أجمعین.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ
سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

۱۔ بعد از حمد و صلوٰۃ بندۂ کمترین گمنام محمد قاسم نام' جناب مخدومی و مطاعی مولوی الٰہی بخش دام فیوضہ کی خدمت میں سلام مسنون عرض کرتے ہوئے قبول کا امیدوار ہے' بعد ازیں عرض کرتا ہے کہ والا نامہ کیا پہنچا کہ اس ناکارہ کو ایک ہی احسان کے ساتھ اپنا مرہون اور بِن دیکھے اپنا نیاز مند بنا لیا۔ مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس گمنامی کے باوجود اس ناکارہ کا نام اس انداز میں سمع عالی تک پہنچے گا' شاید یہ کسی سادہ لوح آدمی کا کام ہو گا' ورنہ میں کہاں؟ اور یہ عنایات بے پایاں کہاں؟ اور وہ بھی اس درجہ کی کہ "خاتمۃ المفسرین" جیسے القاب کے ساتھ یاد فرمایا جائے۔ جناب من! مردی اور چیز ہے اور مردم شناسی دوسری چیز ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ روایت غلط ہے' جس نے کہا اپنے اندازۂ ادراک کے مطابق کہا۔ مجھ بے چارہ ہیچمدان کو مسائل ضروریہ کا یاد ہونا تو درکنار؟ ان پر عبور بھی میسر نہیں' اہل علم کے اشکالات حل کرنے کی نوبت کہاں آسکتی ہے؟ اگر کوئی دل نشین بات میری زبان پر جاری ہوئی ہوگی تو محض حسن اتفاق ہے۔

گاہ باشد کہ کودک نادان
بغلط بر ہدف زند تیرے

(کبھی ایسا اتفاق ہو جاتا ہے کہ نادان بچہ غلطی سے نشانے پر تیر لگا دیتا ہے۔)

لیکن (اپنی بے بضاعتی کے باوصف) امر سامی کی تعمیل کے بغیر چارہ نہیں کہ

جناب کی پہلی عنایت ہی میری حد قدر سے زیادہ ہے' ناچار جو کچھ بھی ہوں بنام خدائے کریم قلم لے کر اپنا ذہنِ نارسا جہاں تک پہنچتا ہے' اسے صفحۂ قرطاس پر رقم کرکے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ مگر پہلے چند امور بطور مقدمہ گزارش کرتا ہوں' جو اصل مطلب کی تقریر کے وقت ملحوظ خاطر رہیں گے۔

## پہلا مقدمہ

۲۔ طالب حق کو لازم ہے کہ نصوص کے معنی مطابقی اور اصل مدلول کو اپنا مستند بنائے اور بعض اطلاقات عرف کے اعتبار سے جو زائد معانی ذہن میں آتے ہیں ان کو لائق التفات نہ سمجھے۔ پس اگر وہ کلام چند محمل رکھتا ہو تو بغیر دلیل عقل و نقل کے اس کے محمل کی تعیین کے درپے نہ ہو کہ یہ روش اکثر راہ مستقیم سے دور ڈال دیتی ہے۔ ہرچند کہ یہ بات عقل کے نزدیک معقول ہے' تاہم اس بات پر کہ اس امر کا لحاظ رکھنا واجب ہے' نقل سے بھی اشارہ لانا چاہئے۔ (اور وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑھیا سے گفتگو کرتے ہوئے بطور مزاح فرمایا کہ **لا تدخل الجنۃ عجوز** یعنی۔ کوئی بڑھیا جنت میں داخل نہیں ہوگی۔ اس خاتون نے معنی مطابقی سے زائد ایک قید اپنی طرف سے بڑھا کر ارشاد نبوی کو اس پر محمول کیا کہ جو عورت اس وقت بڑھیا ہے وہ جنت میں نہیں جائے گی' اس لئے وہ خوف زدہ ہوئی اور دریافت کیا کہ حضورؐ! بوڑھی عورتیں اس نعمت سے کیوں محروم رہیں گی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

أما تقرئين القرآن: ﴿إِنَّآ أَنشَأۡنَٰهُنَّ إِنشَآءٗ فَجَعَلۡنَٰهُنَّ أَبۡكَارًا﴾ (سورة الواقعة: ۳۵ - ۳۶)

(مشکوۃ ص ۴۱۶)

"کیا تم قرآن نہیں پڑھتی ہو؟ (حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ) ہم نے پیدا کیا ان کو ایک اچھی پیدائش پر، پس ہم نے بنایا ان کو کنواریاں۔"

پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کی حقیقت تک رسائی حاصل کریں تو وہ یہ ہے کہ "بڑھیا" کے لفظ کا صرف یہی ایک محمل نہیں کہ جو عورت اس وقت بڑھیا ہو صرف وہی مراد لی جائے، بلکہ اس کا ایک دوسرا محمل بھی ہے، یعنی جنت میں داخل ہونے کے وقت بڑھیا ہونا۔ ایک محمل کو لے کر دوسرے کو چھوڑنا معنی مطابقی سے خارج ہے۔ اس لئے سامع کے لائق حال یہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک محمل کی تعیین کراتا، یہ نہیں کہ معنی مطابقی سے زائد ایک محمل کو اپنی طرف سے طے کر کے اس پر سوال کی بنیاد اٹھاتا۔

## دوسرا مقدمہ

۳۔ اگر عالم اسباب پر غور کیا جائے تو اکثر اسباب و مسببات کے درمیان عموم و خصوص کی نسبت ہے کہ سبب عام اور مسبب خاص نظر آتا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ بعض اسباب کو اپنے مسبب کے ساتھ، دوسرے اسباب کی بہ نسبت، خصوصیت زائدہ ہوا کرتی ہے، جس کی وجہ سے اکثر اس مسبب کا تحقق اسی سبب سے ہوتا ہے، اور یہ چیز اکثر ان لوگوں کے لئے راہزن ثابت ہوتی ہے اور انہیں غلطی میں ڈال دیتی ہے جو معلول سے علت کو، مسبب سے سبب کو اور لازم سے ملزوم کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب تک علت و معلول کی مساوات تحقیق کو نہ پہنچ جائے "استدلال انی" ناتمام رہتا ہے، اور رفع مقدم رفع تالی کا اور وضع تالی وضع مقدم کا نتیجہ نہیں دیتا، چونکہ علم طب میں اکثر و بیشتر مسبب سے سبب کا اور اثر سے موثر کا سراغ لگایا کرتے ہیں، اس لئے قدر شناسان علوم، علم طب کو ظنیات میں شمار کرتے ہیں۔

۴۔ اور یہ قاعدہ نہ صرف یہ کہ اہل معقول کے نزدیک معقول ہے بلکہ منقولات میں بھی معمول بہا ہے۔ کلام ربانی و کلام نبویؐ دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ حضرت خضرؑ کا قصہ جو حضرت موسیٰ (علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام) کی رفاقت میں پیش آیا اس میں حضرت خضر علیہ السلام کے فعل کی تصویب فرمانا اس پر شاہد ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کشتی کے توڑنے اور بچے کو قتل کرنے میں حضرت موسیٰ کا حضرت خضر (علیہما السلام) پر نکیر کرنا اور یہ فرمانا کہ "آپ نے بڑی بھاری بات کی ہے' آپ نے بڑی بے جا حرکت کی ہے۔" محض اس وجہ سے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کشتی کے توڑنے اور بچے کے قتل کرنے کو بادی النظر میں ظلم و فساد پر محمول کیا' کیونکہ ایسی صورتوں میں قتل کا سبب اکثر و بیشتر یہی ہوا کرتا ہے' اور اپنے خیال میں حضرت خضر علیہ السلام کو ظالم سمجھا اور جو کہنا تھا' کہا۔ اور اس سبب کے اکثری ہونے کی وجہ سے حقیقت الامر کی طرف نظر مبارک نہیں گئی۔ آخر کار جب ان کاموں کی حقیقت معلوم ہوئی' تب معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام حق و صواب پر تھے' نہ کہ خطا کار' اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ عین احسان و انصاف تھا' نہ کہ ظلم و جفا۔ اور اس غلطی کا منشا اسی قاعدہ کی رعایت نہ کرنا تھا۔ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنا تجلیات ربانی میں مستغرق اور ازالہ منکرات کی صفت میں محو ہونے اور بغض للہ کے غلبہ کی وجہ سے تھا' بہرحال اس امر کا التزام ہر مستدل کو لازم ٹھہرا۔

۵۔ اور (مشہور قول ہے' جو قرآن کریم کی آیت سے ماخوذ ہے کہ) ظنوا المؤمنین خیرا (اہل ایمان کے بارے میں اچھا گمان رکھو) اس کے معنی بھی اس ہیچمدان کے نزدیک یہی ہیں کہ اگر اہل ایمان سے۔۔۔ جن کے حالات و قرائن ان کے ایمان کے شاہد ہوں۔۔۔ کوئی ایسا امر سرزد ہو جائے جو بظاہر منکر ہو تو اسے محض اسباب معروفہ پر محمول نہ کیا جائے' ہو سکتا ہے کہ ان کے اس فعل کا کوئی اور غیر

معروف سبب ہو' اور اس کے پیش نظر ان کا یہ فعل معروف (یعنی نیک) ہو' منکر (یعنی برا) نہ ہو۔ ورنہ کار خیر میں ظن خیر کا حکم دینے کی کوئی حاجت نہ تھی' کہ یہ خود طبائع بشری کا مقتضا ہے۔

۶۔ اور حدیث میں جو قصہ آتا ہے کہ ایک شخص نے عین لڑائی کے موقع پر کلمہ پڑھا' بعض صحابہ کرامؓ نے یہ سمجھ کر اسے قتل کردیا کہ یہ کلمہ پڑھنا ایمان کی وجہ سے نہیں' بلکہ خوف جان کی وجہ سے ہے۔ اور جب یہ واقعہ بارگاہ نبویؐ میں پیش کیا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کرنے والے صاحب سے فرمایا:

"افلا شققت قلبہ" (صحیح مسلم ص۶۸ ج۱)

یعنی۔ "تو نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا کہ یہ اخلاص سے کلمہ پڑھتا ہے یا محض جان بچانے کے لئے۔"

یہ ارشاد نبویؐ اس دعویٰ پر دلیل کامل ہے کہ جس مسبب کے اسباب متعدد ہوں' اس کو (بغیر کسی قطعی دلیل کے) کسی ایک سبب پر محمول کرکے اس کے مطابق کارروائی کرنا سخت نامناسب ہے۔

## تیسرا مقدمہ

۷۔ انبیاء کرامؑ اور اولیاء عظامؒ اولاد و اقارب کی محبت اور نفس کی دیگر خواہشوں سے یکسر خالی اور معرا نہیں ہوتے' کہ یہ چیز دین و دنیا کے بہت سے نقصانات کی موجب ہے۔

ہرچند کہ یہ بات بظاہر نہایت گراں ہے کہ محبت دنیا و اہل دنیا کے مرادف نظر آتی ہے' اور بہت سے اکابر اولیاء اللہ کے اقوال اس کے خلاف مشعر ہیں' اور میں گمان نہیں کرتا کہ کوئی شخص اول وہلہ میں اس کو قبول کرلے گا' اور ان حضرات

کی نسبت محبت دنیا و اہل دنیا کا معترف ہو گا۔ لیکن اگر اس کی حقیقت پر نظر ڈالیں تو ارباب فہم سے امید ہے کہ بے دریغ اس کو سر آنکھوں پر رکھیں گے۔ اس اجمال کی تفصیل اور اس مقال کی توضیح' باندازۂ وقت اور اپنے ذہن نارسا کے مطابق کرتے ہوئے اس کا اتمام و تکمیل آنجناب کے ذہن ثاقب پر چھوڑتا ہوں۔

۸- پس یہ بات خوب ذہن نشین رہنی چاہئے کہ صبر کی خصلت' کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے ساتھ مامور ہیں' اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو فقدان نعمت' دوسرے نعمت کی رغبت و محبت کا پایا جانا۔ کیونکہ مصیبت و ابتلاء' جو صبر کے ضروریات میں سے ہے' انہی دو عناصر سے ترکیب پاتی ہے۔ ورنہ اگر محض نعمت کے فقدان کا اعتبار کیا جائے (اور اس کے ساتھ اس نعمت کی رغبت و محبت کو ملحوظ نہ رکھا جائے) تو لازم آئے گا کہ (نعوذ باللہ) ابو جہل مقام صبر میں سید الصابرین و سرور مرسلین صلی اللہ علیہ وسلم و علی آلہ و اصحابہ اجمعین سے بڑھ کر ہو' اور نمرود و فرعون حضرت ابراہیم و حضرت موسیٰ (علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام) سے اس راہ میں گوئے سبقت لے جائیں۔ کیونکہ اگرچہ ان انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو اکثر دنیوی نعمتوں سے محروم رکھا گیا' تاہم کسی قدر یہ نعمتیں ان کو عطا بھی کی گئیں۔ مگر (ابو جہل اور نمرود و فرعون وغیرہ) ان اشقیاء کو اخروی نعمتوں اور فضائل نبوی میں سے ایک حبہ بھی نہیں دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی تمام نعمتیں نعمائے آخرت کے ایک ذرہ کے مقابلہ میں کیا قیمت رکھتی ہیں؟ اتنی قیمت بھی نہیں رکھتیں جو آسمان و زمین کے مقابلہ میں ایک ذرہ کی ہو سکتی ہے' پس اگر صبر اسی کا نام ہے کہ آدمی نعمت سے محروم ہو تو لازم آئے گا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا صبر اور ان کی ساری جانفشانیاں ان اشقیاء کے صبر تک نہ پہنچ سکیں' اور یہ لازم قطعاً باطل ہے' جیسا کہ ظاہر ہے۔ اور جب صبر کا تحقق نعمائے مفقودہ کی محبت پر مبنی قرار دیا جائے تو لامحالہ صبر کا زیادہ ہونا محبت کی زیادتی

پر مبنی ہوگا۔ یعنی کسی چیز سے جتنی زیادہ محبت ہوگی اس کے فقدان پر اسی قدر صبر بھی زیادہ ہوگا۔ ورنہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو مدۃ العمر بے سروسامان رہے اور بظاہر بہت سی تکلیفوں میں زندگی بسر کی' ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ ان کا صبر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے صبر کے ہم سنگ ہوسکتا ہے۔ یہیں سے ارشاد نبویؐ ما أوذی نبی ما أوذیت (کنز العمال' حدیث: ۵۸۱۷۔ ۳۲۱۴۰۔) (یعنی کسی نبی کو اتنی ایذائیں نہیں دی گئیں جس قدر کہ مجھے دی گئیں) کی تفسیر معلوم کرنی چاہیے۔

۹۔ الغرض اولاد و اقارب کی محبت کاملین کے دل میں بوجہ اکمل ہوا کرتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت' جو اپنی جہت و مقتضا میں محبت مذکورہ کے معارض ہے' ان حضرات کے قلوب پر اوپر نیچے اسے اس طرح محیط ہوتی ہے کہ دوسروں کی محبت اس کے سامنے مغلوب اور مضمحل ہوجاتی ہے' اور وہ کسی موقع پر اس انداز میں ظہور پذیر نہیں ہوتی کہ اپنا کام کرسکے۔ جس طرح بھائی کی محبت بیٹے کی محبت کے نیچے چھپ جاتی ہے' اسی طرح دنیا اور اہل دنیا کی محبت بھی محبت خداوندی کے دامن میں روپوش ہوجاتی ہے۔ اور تزکیہ و تصفیہ درحقیقت اسی سے عبارت ہے کہ غیراللہ کی محبت' اللہ تعالیٰ کی محبت میں محو ہوجائے۔ اور یہ جو بعض اکابر اولیاءؒ کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کے دلوں سے دنیا کی محبت نکل جاتی ہے' ان کی مراد۔ واللہ اعلم۔ یہی ہے (کہ دنیا کی محبت' محبت خداوندی میں محو اور فانی ہوجاتی ہے) یہ نہیں کہ مرد مجاہد غیراللہ کی محبت کو' اسی طرح دوسرے رذائل کو' جو درحقیقت اسی (غیراللہ کی محبت) سے جنم لیتے ہیں' بیخ و بن سے نکال کر پھینک دیتا ہے۔ کیونکہ یہ چیز انفکاک ذاتیات اور اس کے لوازم کے قبیل سے ہے (جو عقلاً محال ہے)۔

مع ہذا اولاً: حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: لا تبدیل لخلق اللہ (الروم: ۳۰)
(یعنی: اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی)۔

ثانیاً: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

إذا سمعتم بجبل زال عن مكانه فصدقوه، وإذا سمعتم برجل تغير عن خلقه فلا تصدقوه فإنه يصير إلى ما جبل عليه. (مشکوٰۃ ص۲۴)'(مسند احمد ص۴۴۳ ج۶)

"جب تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے اس کو تو مان لو' اور جب تم کسی آدمی کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی طبیعت سے بدل گیا ہے تو اس کو نہ مانو' کیونکہ وہ اسی چیز کی طرف لوٹے گا جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔"

اور عزیز و اقارب کی محبت اور نعمتوں کی رغبت کا طبعی ہونا ایسا ظاہر ہے کہ اس کے ثابت کرنے کے درپے ہونا محض عبارت کا دراز کرنا ہے۔ مگر چونکہ محبت خداوندی اور محبت اغیار دونوں متعارض اور متنافی ہیں' اس لئے جس وقت محبت خداوندی کا غلبہ و شدت جس قدر کم ہوگی لامحالہ محبت اغیار اسی قدر ظہور پذیر ہوگی' اور یہ بات اپنی جگہ معروف و معلوم ہے کہ محبت خواہ کسی قسم کی ہو' اس کا جوش اور ہیجان ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہا کرتا' کبھی محبت الٰہی جوش میں آتی ہے تو بظاہر محبت غیر کا نام و نشان نہیں چھوڑتی' جیسا کہ ارشاد نبویؐ ہے:

لي مع الله وقت لا يسعني فيه ملك مقرب ولا نبي مرسل. (ذکرہ القاری فی الموضوعات الکبیر ص۱۰۲ وقال: یذکرہ الصوفیۃ کثیرا' وہو فی رسالۃ القشیری)

"میرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت ہوتا ہے جس میں نہ کسی مقرب فرشتے کی گنجائش ہے' نہ کسی نبی مرسل کی۔"

اور کسی وقت اس کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور دوسروں کی محبت کو سر اٹھانے کی فرصت دیتی ہے۔ اسی قسم کے اوقات میں یہ ہوا ہوگا کہ سبط اکبر

(حضرت حسن) رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

اللهم إنى أحبه فأحبه.

(متفق علیہ من حدیث البراء۔ مشکوۃ ص ۵۶۸)

"یا اللہ! میں ان سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ بھی انہیں اپنا محبوب بنا لیجئے۔"

اسی طرح کے دوسرے واقعات جو حضرات حسنین اور حضرت حمیراء رضی اللہ عنہم اجمعین کی محبت کے معاملات میں مشعر ہیں۔

۱۰۔ الغرض اس شکستہ خاطر کی نظر قاصر میں یوں آتا ہے کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اقارب کے ساتھ محبت سب سے زیادہ تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

كل نسب وصهر وينقطع يوم القيامة إلا نسبى وصهرى. (درمنثور ص ۱۵ ج ۵۔ کنز العمال ص ۴۰۹ ج ۱۱۔ حدیث: ۳۱۹۱۵)

"تمام نسبی اور دامادی رشتے قیامت کے دن ٹوٹ جائیں گے، سوائے میرے نسبی و دامادی رشتے کے۔"

یہ ارشاد بھی اسی کی خبر دیتا ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رابطہ محبت و علاقہ یگانگت اپنے اقارب کے ساتھ ایسا مضبوط و مستحکم ہے کہ ایسے دن کے ہول کی شدت کے صدمہ سے بھی نہیں ٹوٹے گا، جبکہ سب لوگ نفسی نفسی پکارتے ہوئے ایک دوسرے کو بھول جائیں گے، اور ہر شخص اپنے عزیز و اقارب سے بیگانہ وار منہ پھیر لے گا۔ پس (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنے اقارب سے سب سے بڑھ کر ہے تو) لامحالہ کسی نہ کسی وقت اس کا کوئی نہ کوئی اثر

ضرور ظاہر ہوگا۔ کیونکہ مشہور مقولہ ہے' **الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ** (یعنی جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو اپنے لوازمات کے ساتھ ثابت ہوتی ہے) اگرچہ محبت خداوندی' محبت اقارب کو اپنے مقتضا کے اندازے سے باہر پاؤں رکھنے نہیں دیتی۔

## چوتھا مقدمہ

۱۱۔ کسی چیز کی خبر نہ دینا' اس چیز کے عدم کی خبر دینے کے ہم معنی نہیں' جیسا کہ ظاہر ہے' اور آیت شریفہ **ولا تقف ما لیس لک بہ علم** (بنی اسرائیل:۳۶) اس کی موید ہے۔ (یعنی ایسی چیز کے درپے نہ ہو جس کا تجھ کو علم نہیں)

(شرح اس کی یہ ہے کہ ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی چیز کے نہ ہونے کی خبر دی جائے کہ فلاں چیز وقوع میں نہیں آئے گی' اور ایک صورت یہ ہے کہ کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں خبر نہ دی جائے' بلکہ اس معاملہ میں خاموشی اختیار کی جائے' پہلی صورت میں اس چیز کا وقوع میں آنا ممکن نہیں' ورنہ خبر کا کاذب ہونا لازم آئے گا' اور دوسری صورت میں چونکہ اس شے کے وقوع یا عدم وقوع کی خبر نہیں دی گئی' بلکہ اس کے معاملے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے' لہٰذا اس چیز کا وقوع میں آنا اور نہ آنا دونوں ممکن ہیں' اس سے واضح ہوا کہ کسی چیز کی خبر نہ دینا اس چیز کے عدم کی خبر دینے کے ہم معنی نہیں۔)

۱۲۔ ان مقدمات کے بعد گزارش ہے کہ حدیث شریف کے جملہ **ولا اراکم فاعلین** میں نفی مفعول ثانی سے فعل "اریٰ" کی طرف محول ہے' جو کہ افعال قلوب میں سے ہے۔ (یعنی اس جملہ میں بظاہر نفی فعل "اریٰ" پر داخل ہے' لیکن درحقیقت یہ نفی اس کے مفعول ثانی یعنی فاعلین کی طرف راجع ہے۔) کیونکہ

بظاہر اس کلام سے مقصود عدم فعل کی خبر دینا ہے بطور انکشاف' نہ کہ عدم انکشاف فعل کے جزم و یقین کا اظہار کرنا۔ (یعنی بظاہر اس جملہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس امر کا انکشاف ہوا کہ صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ کو امیر نہیں بنائیں گے' گویا ان کے عدم فعل کے انکشاف کی خبر دینا مقصود ہے' یہ بتلانا مقصود نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بات کا انکشاف نہیں ہوا کہ صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ کو امیر بنائیں گے یا نہیں بنائیں گے؟ گویا اپنے عدم انکشاف کے جزم و یقین کا اظہار مقصود نہیں) ورنہ (اگر عدم انکشاف کو مقصود کلام قرار دیا جائے تو اندریں صورت) سنیوں کے دامن کو شیعوں کی کشمکش اور عبداللہ بن سبا کے مقتدیوں کی دارو گیر سے' جو اس مقام میں ہو سکتی ہے' کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس توجیہ کی بنا پر جملہ ولا أراکم فاعلین صحابہ کرامؓ پر تعریض کا ماخذ ہی نہیں ہو سکتا (اس لئے کہ اس جملہ میں رؤیت سے رؤیت قلبی یعنی علم مراد ہے' تو نفی رؤیت کے معنی نفی علم کے ہوئے' اور مطلب یہ ہوا کہ مجھے اس بات کا علم نہیں کہ تم اس کام کو کرو گے یا نہیں کرو گے؟ اس صورت میں صحابہؓ پر تعریض کی کیا گنجائش رہی؟)

(اور یہ جو عرض کیا گیا کہ اس جملہ سے مقصود عدم فعل کی بطور انکشاف خبر دینا ہے) اس توجیہ کی تعیین کے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ آنجناب نے بھی اسی معنی کو مسلم رکھا' ورنہ آنجناب نے جو فرمایا کہ اس فقرہ کی مراد تحریر کی جائے' اس کی کیا حاجت تھی؟

۱۳۔ اور یہ قلب و تحویل فقط میری تراشیدہ نہیں' بلکہ کلام ربانی اور احادیث نبوی..... علی مصدرہا الصلوٰۃ والسلام..... میں باقرار جمیع اہل فہم بہت سی جگہ واقع ہے۔ ایک ایک جملہ کلام خداوندی اور کلام نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے

جو جواز تحویل و استعمال قلب پر دلالت کرتا ہے' بطور نمونہ ذکر کرتا ہوں۔ ارشاد ربانی: لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ (المنافقون:۹) میں نہی مخاطبین کے بجائے اموال و اولاد کی جانب پھیر دی گئی ہے۔ (یعنی بظاہر اموال و اولاد کو منع کیا جارہا ہے کہ وہ تمہیں ذکر الہٰی سے غافل نہ کردیں) لیکن مقصود (خود مخاطبین کو منع کرنا ہے' اور کہنا) یہ ہے کہ تم لوگ اموال و اولاد میں مشغول ہو کر ذکر الہٰی سے غافل نہ ہو۔

حدیث شریف میں ہے۔

إنكم معروضون على أعمالكم. (مشکوۃ ص ۴۴۵)

"تم پیش کئے جاؤ گے اپنے عملوں پر۔"

بظاہر مراد یہ ہے کہ "تمہارے اعمال تم پر پیش کئے جائیں گے۔"

زیادہ سے زیادہ یہ کہ یہاں تحویل اور طرح کی ہے' اور وہاں دوسری قسم کی۔ لیکن زیر بحث تحویل میں ایک تو عدم فعل کی نسبت کی تاکید ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل کو نہ دیکھنا' دراں حالیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر تمام نظروں سے وسیع تر ہے' اور اس نوع کے پیش آنے والے واقعات کو محیط ہے' عدم فعل کی دلیل ہے۔ اور اسی تحویل کے سبب یہ جملہ **قضایا قیاساتہا معہا** کے قبیل سے ہو گیا۔ (**"قضایا قیاساتہا معہا"** ایسے جملوں کو کہا جاتا ہے کہ اگر ان کے موضوع و محمول اور نسبت کا مفہوم ٹھیک سے سمجھ لیا جائے تو ان کی صداقت آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے' ان پر کسی الگ دلیل کے قائم کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔) علاوہ ازیں اس میں لطیف اشارہ ان لوگوں کے جواب کی طرف ہے جنہوں نے جملہ **ولا اراکم الخ** کو صحابہ کرامؓ کی تعریض کی طرف کھینچا اور اسے اپنے عقیدۂ فاسدہ کی سند اور صحابہ کرامؓ کی جانب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں دربارۂ خلافت ظلم و تعدی کے صدور کی دلیل ٹھہرایا۔

۱۴۔ توضیح اس کلام کی یہ ہے کہ (جملہ ولا اراکم میں فعل کے دیکھنے کی نفی ہے اور) فعل کو نہ دیکھنا عدم فعل کو دیکھنے سے عام ہے 'کیونکہ (عدم فعل کو دیکھنا تو صرف اسی صورت ہو گا جب کہ فعل کو نہ ہوتے ہوئے دیکھا ہو اور) فعل کو نہ دیکھنا (صورت مذکورہ کے علاوہ) اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے جب کہ فعل تو ہوا ہو لیکن دیکھنے والے نے اس کو نہ دیکھا ہو' پس اگر اس جملہ کو اپنی اصل پر رکھیں اور تحویل کا اعتبار نہ کریں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ظلم کو ثابت کرنے والوں کے لئے یہ جملہ حجت نہیں بن سکتا۔ پس مقصود کو اس پیرائے میں ادا کر کے دشمنان صحابہؓ کو دوسرے خیال میں ڈال دیا گیا' تاکہ بے ادبوں کا ہاتھ ان کے پاک دامن کی طرف دراز نہ ہو۔ لیکن جو حضرات کہ طبع سلیم و فہم مستقیم رکھتے ہیں وہ خود جانتے ہیں کہ اس کلام کے معنی مطابقی اس سے زیادہ نہیں کہ "میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر نہیں بناؤ گے۔" رہا یہ مضمون کہ "ان کے فضائل و کمالات سے آنکھیں بند کر کے محض ہوائے نفسانی کے تقاضا سے دیدہ و دانستہ ان سے اعراض کرو گے۔" میں گمان نہیں رکھتا کہ اربابِ فہم اس مضمون پر اس جملہ کی دلالت کے مدعی ہوں گے۔ علاوہ ازیں ان کو امیر نہ بنانا محض کینہ و عناد میں منحصر نہیں کہ یہ دلالت عقلی سے ثابت ہو جاتا۔ ہاں! یہ جملہ اس کا بھی احتمال رکھتا ہے اور ایک دوسرا محمل بھی رکھتا ہے۔ یعنی حدیث نبویؐ:

ويأبى الله والمؤمنون إلا أبا بكر.

(ابو داؤد ص ۲۸۵' کتاب السنہ' باب استخلاف ابی بکر رضی اللہ عنہ)

ترجمہ۔ "اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا سب کا انکار کرتے ہیں۔"

کے مضمون کی طرف اشارہ ہو' اور پہلا احتمال محض احتمال ہی احتمال ہے (جس

پر کوئی قرینہ نہیں) جبکہ دوسرے احتمال کی تائید حدیث مذکور سے، نیز دیگر نصوص سے مہیا ہو رہی ہے، نیز بملاحظہ مناقب صحابہؓ عقل بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ پس حیف ہے کہ بغیر دلیل کے محض احتمال سے چمٹے رہیں اور جو قرائن کہ تعیین مراد پر دلالت کرتے ہیں ان سے دیدہ ودانستہ آنکھیں بند کرلیں۔

۱۵۔ مگر شاید اس مقام میں کسی کے دل میں ایک اور وسوسہ آئے اور یہ کہے کہ وجدان کی شہادت یہ ہے کہ ایسا کلام اظہار حسرت و تمنا کے موقع پر سرزد ہوا کرتا ہے، پس دیدۂ انصاف کھول کر دیکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار حسرت اور آپؐ کی آرزو کلام کو کس محمل پر پھینکتی ہے اور سیاق کو کس جانب کھینچتی ہے؟

میں کہتا ہوں کہ اول تو وجدان کی شہادت مسلم نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ حسرت وافسوس کے بغیر، مطلق اخبار بالغیب مدنظر ہو، اور اگر بپاس خاطر شیعہ اس کو قبول بھی کرلیں، اور اس احتمال سے بھی قطع نظر کرلیں کہ یہ ارشاد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولیت کے انکشاف سے پہلے کا ہو، تب بھی اس جملہ سے ان کی مطلب براری ناممکن ہے، کیونکہ جب انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے بشری تقاضے ناگزیر ہیں، جیسا کہ مذکور ہوا، اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی تمنا رکھتے ہوں تو کون سا محذور لازم آتا ہے کہ اہل سنت وجماعت اس کی جواب دہی کی فکر میں جگر کو خون کریں۔

۱۶۔ اور اگر اس تقریر سے بھی سینہ وسوسے سے پاک نہ ہو تو لیجئے! یہ روایت بھی موجود ہے:

حافظ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں، ان آیات واحادیث کے ذکر میں، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف مشیر ہیں، لکھتے ہیں:

أخرج الدار قطنى فى الأفراد والخطيب وابن عساكر عن علی رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ سألت الله أن يقدمك ثلاثا فأبى على إلا تقديم أبی بکر رضی الله تعالی عنه. (تاريخ الخلفاء، ص٥٤)

ترجمہ۔ "دار قطنی نے افراد میں اور خطیب اور ابن عساکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تین مرتبہ بارگاہ الٰہی میں تمہارے مقدم کرنے کی درخواست کی، مگر اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو مقدم کرنے سے انکار کردیا۔"

مان لیجئے کہ اس حدیث کی تخریج کرنے والوں کے سنی ہونے کی وجہ سے شیعوں کو تسکین نہیں ہوگی، مگر اس بارے میں کیا کہیں گے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر و انور پر کیا کچھ قلق نہ گزرے؟ آخر یہ ساری بے تابیاں کس وجہ سے تھیں؟ بجز اس کے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی محبت نے نوبت یہاں تک پہنچائی، اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ ہاں! اگر ابو جہل کی بیٹی سے نکاح حرام ہوتا تو اس سے منع کرنے کے لئے یہ اہتمام فرمانا اور خطبہ ارشاد فرمانا مقتضائے نبوت پر منطبق ہو سکتا تھا۔ اس قصہ کا سیاق حدیث میں دیکھ لیا جائے، معلوم ہو جائے گا کہ یہ تمام ترنج والم حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی محبت کی بنا پر تھا، ورنہ اس ارشاد کا کیا محل تھا کہ "میں حلال کو حرام نہیں کرتا۔"

۱۷۔ الغرض کچھ عجب نہیں کہ زیر بحث واقعہ میں بھی کم و بیش طبیعت بشری و محبت نسبتی کی بنا پر خاطر انور کا میلان حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی جانب ہو، مگر

ابوجہل کی بیٹی حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی زوجیت کا استحقاق نہیں رکھتی تھی اور اس نکاح کا منعقد ہونا ضروریات شرع میں سے نہیں تھا کہ اس کا لحاظ کرتے ہوئے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے قلب مبارک کے رنج کو' جو فی الواقع اپنا رنج تھا' گوارا کرلیا جاتا اور اقارب کی غم خواری وصلہ رحمی کی خوبی سے صرف نظر کرتے ہوئے اس بارے میں اہتمام نہ فرمایا جاتا۔ بخلاف زیر بحث واقعہ کے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کمالات سابقہ کی بنا پر اور ان کی اول سے آخر تک کی جانفشانیوں کے مدنظر' جن کو شیعہ بھی جانتے ہیں' اگرچہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں' لازم ہوا کہ تقاضائے محبت طبعی سے برطرف رہیں' اور حقدار کو اس کا حق پہنچائیں' چنانچہ وقتاً فوقتاً مناسب مواقع پر اس بارے میں اس قدر ارشادات فرمائے کہ جو حضرات فہم سخن کی مشق رکھتے ہیں وہ دلالت نصوص کو بھی ان کے ہم سنگ قرار نہیں دیتے' مگر اندھے کی آنکھ کو آفتاب بھی سیاہ دکھائی دیتا ہے' اور زکام کے مریض کی قوت شامہ کو تیز گلاب بھی ماؤف کر دیتا ہے۔

۱۸۔ حاصل یہ کہ جملہ **"ولا اراکم فاعلین"** سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان خاطر سمجھنا اور پھر اس رجحان طبیعت اور میلان خاطر نبوی (علیہ وعلی آلہ الف الف تحیۃ وسلام) سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استحقاق کا سراغ لگانا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان کو امیر نہ بنانے کو کینہ و فساد اور ظلم و عناد پر مبنی سمجھنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس قسم کے فرقوں کی خبر نہیں رکھتے۔ نہ ان کی معنی مطابقی پر نظر ہے' نہ سبب و مسبب کے عموم و خصوص کی خبر ہے' ان تمام امور کے ساتھ ساتھ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے طبعی مقتضیات کو وحی الٰہی سمجھتے ہیں' اس لئے ناگفتنی باتیں کہتے ہیں۔ معانی سنجان اہل انصاف کی روش یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کلام کے اصل مدلول پر نظر ڈالتے ہیں' پھر عموم مسبب پر نظر رکھتے ہیں' اس کے بعد انبیاء کرام علیہم السلام کو بشر جان کر اس جملہ کے معنی پر غور کرتے

ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر اس کلام سے اہل سنت کے مذہب پر کوئی طعن نکلتا ہو تو اس حدیث سے استناد کرتے ہوئے شیعہ کا شور و غوغا البتہ بجا ہوگا۔

۱۹۔ یہ تمام تقریر تو اس صورت میں ہے کہ "من نومر بعدک" میں بعدیت سے بعدیت متصلہ مراد لی جائے، اور رؤیت سے رؤیت انکشافی مراد ہو، اور اگر رؤیت سے رؤیت استدلالی مراد لی جائے تو جواب کی حاجت تو ایک طرف، اعتراض کے وارد ہونے میں بھی کلام ہے۔ کیونکہ استدلال کا راستہ پیچ در پیچ ہے، اور اس میں خطا کا واقع ہونا ممکن ہے، خواہ نبی سے ہو خصوصاً شیعہ کے نزدیک کہ ان کا تو خدا بھی خطا کر جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کو بدا واقع ہو جاتا ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کی تو کیا بات ہے؟ قیدیان بدر کے رہا کرنے کا قصہ مشہور ہے۔ دوسرے استدلات کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جائے۔ اس صورت میں خود حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا امیر ہونا ہی اس پر دلالت کرتا ہے۔

اور اگر بعدیت مطلقہ مراد ہو تو تعریض مذکور کا ثابت ہونا تو کجا؟ الٹا اس امر کے جواب کی فکر لازم ہوگی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بے ساختہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو امیر بنا دیا، اور کچھ نہ سوچا کہ اس سے (نعوذ باللہ) حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا خلاف واقعہ ہونا لازم آئے گا۔

۲۰۔ مگر حق یہ ہے کہ رؤیت سے رؤیت انکشافی مراد ہے اور "من نومر بعدک" میں بعدیت سے بعدیت مطلقہ مراد ہے، اور سوال سے مقصود اشخاص کی تعین ہے، نہ کہ اوصاف کا معلوم کرنا۔ اور اگر بعدیت کو بشہادت عرف، اور اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ قیامت تک کے تمام خلفاء کی تعین کرانا مقصود نہیں تھا، بعدیت متصلہ میں منحصر رکھیں تب بھی جواب تو مطلق ہے۔ اور سوال کے مقید ہونے کے باوجود جواب کو مطلق رکھنا اگرچہ تنگ نظر، بے بصیرت لوگوں کی

آنکھوں میں نہیں سمائے گا اور وہ یہ کہیں گے کہ سوال کچھ اور ہو، اور جواب کچھ اور؟ علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک آنے والے تمام خلفاء کی خبر نہیں دی، فقط اصحاب ثلثہؓ کے احوال کو ذکر فرمایا، جس سے بظاہر بطور تخمیر ان اکابر میں سے کسی ایک کے استخلاف کا اشارہ فرمایا۔ مگر اہل بلاغت سے پوچھئے کہ اطلاق و تقیید کی اس مخالفت نے اور اصحاب ثلثہ کے اوصاف کے بیان نے کلام کو بلاغت سے گزار کر حد اعجاز تک پہنچا دیا۔ گو مجھ کم فہم کو حق نہیں کہ اس کلام کی خوبی کے دعوی اور اس کے اشارات کے بیان میں لب کشائی کروں، کہ یہ درحقیقت اپنے فہم کی مدح و ستائش ہوگی (مولانا رومیؒ نے کیا خوب فرمایا!)۔

مادح خورشید مداح خود است

کہ دو چشمم روشن و نامرمد است

(آفتاب کی تعریف کرنے والا درحقیقت اپنی مدح کرتا ہے کہ میری دونوں آنکھیں روشن ہیں، اندھی نہیں)۔

۲۱۔ لیکن بات زبان پر آگئی تو کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا، امید ہے کہ میرے بیان کے سقم پر قہقہہ نہیں لگائیں گے، عنایت فرما کر غور سے نظر کریں گے کہ اس کلام میں، جو سراسر اعجاز ہے، سب سے پہلے آیت کریمہ: **و یسئلونک عن الاہلۃ، قل ہی مواقیت للناس الایۃ** (البقرۃ: ۱۸۹) کے مطابق انداز سوال سے ہٹ کر جواب مرحمت فرمایا، جس سے سائل کے سوال کے نقص پر تنبیہہ فرمائی گئی۔ بعد ازاں جملہ خلفاء کے بیان کی طرف متوجہ ہوئے، مگر چونکہ ان کے اشخاص کی تعین میں کلام طول پکڑتا اور منفعت قلیل ہوتی۔ اس لئے سائل کی تسکین خاطر کے لئے چند اوصاف بیان فرمائے، جن سے سائل کے سوال کا جواب بھی نکل آئے اور قیامت تک خلفاء کے تقرر کے سلسلہ میں اُمتیوں کے ہاتھ میں ایک دستور العمل

بھی موجود رہے' واقعی دریا کو کوزے میں بند کردیا اور ایک بڑے مضمون کو چند الفاظ میں بیان فرمادیا۔

چونکہ اس معما کی شرح اس پر موقوف ہے کہ حقیقت خلافت اور لوازم نبوت کو بیان کیا جائے' اس لئے اپنے فہم ناقص کے مطابق ذرا سا اشارہ اس کی طرف کرتا ہوں۔

۲۲۔ جناب من! کسی کا خلیفہ وہ شخص ہوا کرتا ہے جو اس کا کام کرے' پھر اگر وہ کام کسی منشائے کمال اور ملکہ پر موقوف ہو تو لامحالہ اس ملکہ سے بھی اس خلیفہ کو کم و بیش کچھ نہ کچھ حصہ نصیب ہوگا' ورنہ اس مصرعہ کا مصداق ہوگا۔

ایں رہ کہ تو میروی بترکستانست

مگر چونکہ گفتگو خلافت نبوت میں ہے' اس لئے پہلے ضروریات نبوت کی شناخت کرنی چاہئے تاکہ خلافت نبوت میں بھی ان ضروریات کو ملحوظ رکھا جائے۔ پس اس شکستہ خاطر کی نظر قاصر میں یوں آتا ہے کہ نبی کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ کمال قرب کو پہنچا ہوا اور نہایت برگزیدہ ہو' کہ ایک عالم کی افسری اور بنی نوع کی رہبری ہر کس و ناکس کو نہیں دیا کرتے۔ اب چونکہ اس کی قوت نظری کا جمال اور قوت عملی کا کمال معرض امتحان میں ہے کہ کہاں سے کہاں تک پہنچا ہوا ہے' لہٰذا اسے اسرار احکام اور قواعد تدبیر ہدایت سکھا کر گرفتاران ضلالت کی جانب روانہ کرتے ہیں' پس اگر وہ لوگ اس کے کہنے پر قیود رسوم توڑ ڈالیں تو ٹھیک' ورنہ جو شخص اس کے ساتھ دست و گریبان ہو اسے زور ہمت کے ساتھ زیر و زبر کر ڈالے' یا اپنی جان پر کھیل جائے۔

۲۳۔ پس اس تقریر سے تین امر ہاتھ آئے' جو جدا جدا اصحاب ثلثہ کے عنوان سے حدیث میں مذکور ہیں' اور سب کی اصل اس حد تک کمال قرب ہے جس میں بعد کے نام کے دخل کی بھی گنجائش نہ رہے' مگر چونکہ ایسا قرب اس ذات عالی کے

ساتھ' جو استغنا کی بلندیوں میں وراء الوراء ہے' ان لوگوں کے لئے جو ہوا و ہوس کی پستی میں گرے ہوئے ہیں' زہد عن الدنیا اور رغبت فی الآخرہ کے دو شہپروں کے بغیر محالات میں سے ہے' اس لئے سب سے پہلے تو نبی کے لئے یہ لازم ہوا کہ وہ ان دو کمالوں میں کمال رکھتا ہو۔ دوسرے اس کے لئے ہمت قوی اور عزم بلند درکار ہے کہ اپنے کام میں ننگ و ناموس کی بھی پرواہ نہ رکھتا ہو' جو کہ' جیسا کہ تم جانتے ہو' جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ تیسرے اس کے لئے لوگوں کے حال کی نگہداشت ضروری ہوئی' تاکہ نیک و بد کو پہچان کر نیک کام کی ہدایت فرمائے' اور برے کام سے منع کرے۔ یہ تین چیزیں ہیں جو نبی کے لئے ضروری ہیں' اور یہیں سے ان اوصاف ثلثہ کی' جو اصحاب ثلثہ کے لئے نامزد کئے گئے' وجہ تخصیص معلوم ہو گئی۔

۲۴۔ مگر ان اوصاف ثلثہ کا اگر ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے دیکھیں تو ان کے درمیان ایسا فرق مراتب محسوس ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو نہیں پہنچتا۔ توضیح اس راز کی یہ ہے کہ نبوت کی اصل اور اس کا مصداق صرف کمال قرب ہے اور بس' اور ہدایت خلق اس کے آثار و مقتضیات سے ہے' اور ہمت قوی اس کے آلات میں سے ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ہدایت کے لئے ضلال اور اہل ضلال کی ضرورت ہے' اور ہمت قوی کو اپنا کام کرنے کے لئے مخالفوں کی مخالفت درکار ہے' ورنہ اگر مخالفت نہ ہو تو ہمت کس سے مقابلہ کرے گی؟ اور گمراہی نہ ہو تو ہدایت کس سے لڑے گی؟ ادھر کمال قرب کو دیکھئے تو اس کو سوائے ذات ربانی کے کسی چیز کی ضرورت نہیں' اور ظاہر ہے کہ آلات کی ضرورت ہمہ وقت نہیں ہوا کرتی' اور آثار کے لئے لزوم ضروری نہیں کہ وہ ہمہ دم مرتب ہوا کریں' البتہ نبوت کی اصل اور مصداق کہ کمال قرب کا نام ہے' وہ ہر لحظہ ناگزیر ہے' نیز ہدایت کی توجہ غیر کی طرف ہے اور زہد فی الدنیا و رغبت فی الآخرہ' جو کہ

قرب کے ملزومات ہیں) ان کا رخ تمام تر حق تعالیٰ شانہ کی ذات محض کی طرف ہے' اور قوت ہمت کا رخ دونوں طرف ہے کہ مقام قرب کے علوم و معارف سے احکامات وصول کرتی ہے' اس کے بعد قوت عاقلہ و عاملہ کو ہدایت کے کام میں استعمال کرتی ہے۔ جب یہ ایسا ہے تو اول یعنی زہد کا مرتبہ اول ہوا' اور دوم یعنی ہمت بلند اور عزم قوی کا مرتبہ دوسرا ٹھہرا۔ علیٰ ہٰذا القیاس نگہداشت تیسرے مرتبہ پر ہوئی۔

پس اگر ان اوصاف ثلٰثہ میں کسی کا قدم اس طرح آگے ہو کہ دوسرے اس کے گرد نہ پہنچ سکیں تو اگر وصف اول یعنی زہد ہے تو علی الاطلاق اس کا استحقاق سب سے پہلے ہوگا' ورنہ دیکھنا چاہئے کہ اگر مہمات عظیمہ رونما ہوں تو امانت خلافت' صاحب ہمت بلند اور قوی دل کے سپرد کرنی چاہئے' اور اگر حوادث ضلال اور شیوع بدعات دین قدیم میں رخنہ انداز ہوں یا ان کا خطرہ دل میں کھٹکے تو ہادی و مہدی کو مسند خلافت پر لایا جائے' کیونکہ مثل مشہور ہے کہ "ہر کارے و ہر مردے۔"

۲۵۔ اب سننا چاہئے کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے قاعدۂ استخلاف ضبط فرمایا' جیسا کہ اوپر مذکور ہوا' اس کے بعد اصحاب ثلٰثہ میں سے ہر ایک کے مراتب' بیان اوصاف کے ضمن میں' بیان فرما کر ترتیب ذکری کی مکرر تاکید فرمائی۔ نیز اشارہ فرمایا کہ ان اصحاب ثلٰثہ میں سے ہر ایک کو ایک الگ کام کے لئے بنایا گیا ہے' اور انہیں الگ الگ کمال کے ساتھ نوازا گیا ہے۔ چنانچہ اگر طلب ربانی کا درد عارض حال ہو اور اس کے لئے رہبر کی ضرورت پیش آئے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا دامن پکڑنا چاہئے کہ اس راہ میں ان کا قدم سب سے آگے ہے' اور اگر مہمات عظیمہ اور معاملات بزرگ پیش آئیں اور عام و خاص کی تربیت کی ضرورت آن پڑے تو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ سے اس کام کے

اہتمام کی التماس کی جائے کہ وہ اس کام کے آدمی ہیں، ہمت قوی اور عزم مصمم رکھتے ہیں اور احکام الٰہی کے نافذ کرنے میں نہ کسی کا لحاظ رکھتے ہیں، نہ کسی کا خوف۔ وہ کسی سے اندیشہ ملامت نہیں رکھتے، نہ حق ان کو چھوڑتا ہے اور نہ وہ حق کو چھوڑتے ہیں۔ اور اگر بدعات واہوا کے ظہور کی وجہ سے حق و باطل کے گڈمڈ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے زیر سایہ پناہ لی جائے کہ ان کا سینہ، جو اسرارِ الٰہی کا گنجینہ ہے، ہدایت مطلق کے آفتاب کا مطلع و مشرق ہوگا۔

۲۶۔ یہیں سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے فہم و فراست کا اندازہ کیا جائے کہ انہوں نے اس قسم کی احادیث نبوی پر کیسی گہری نظر ڈالی اور ان کی تعمیل میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ یعنی جب جاذبہ الٰہی نے حبیب رب العالمین سید المرسلین علیہ افضل التسلیمات و اکمل التحیات کو دار دنیا سے اپنے جوار رحمت میں کھینچ لیا تو آپ کے پسماندگان وہی حضرات تھے جنہوں نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ کے ماسوا کو دل سے نکال پھینکا تھا، جان و دل سے طلب حق میں مصروف ہو گئے تھے، اور ہر دم ہل من مزید پکارتے تھے۔ اس لئے مناسب یوں ہوا کہ ایسے باکمال حضرات کی سرداری و سربراہی کے لئے ایک ایسا شخص سامنے لایا جائے جو اس راستہ کے نشیب و فراز سے آشنا ہو، جو اس درد کی دوا جانتا ہو، اور زہد فی الدنیا و رغبت فی الآخرۃ کا راستہ جس کا پامال راستہ ہو، تاکہ ان حضرات کی تربیت کر سکے اور ان کے ظاہر و باطن کی اصلاح کرے۔ چنانچہ بہت سے نصوص سے قطع نظر اور اس باب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت سے بھی قطع نظر خود اسی حدیث کی عبارت نے صحابہ کرامؓ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف اشارے پا کر دست بیعت ان کی طرف بڑھایا اور انہیں سجادہ نبوی پر بٹھایا، چونکہ اس زمانے میں جہاد بھی شریعت و

طریقت کے ارکان میں سے تھا کہ مشقت و منفعت میں کوئی مجاہدہ اس کے ہم سنگ نہیں' اور دیگر مصلحتیں جیسے ترقی اسلام و تکثیر غنائم وغیرہ بھی اسی پر موقوف تھیں' اس لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سامان جہاد فراہم کیا اور شام و عراق کی طرف لشکر پر لشکر بھیجنا شروع کئے۔ بہت سے علاقے اسلام کے زیر نگین آئے' بہت سے گروہ مسلمان ہوگئے' اور اکثر لوگوں نے جزیہ ادا کر کے جان کا امان حاصل کیا' اور بے شمار اموال دارالخلافہ میں پہنچنے لگے' اسی دوران حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو داعیہ اجل پیش آیا اور وہ بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے رحمت حق سے جا ملے۔

۲۷۔ چوں کہ اس عرصہ میں جہاد کی یہ مہم بہت بڑھ چکی تھی' اور اس کے بڑھاؤ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا' ایک عظیم الشان مملکت کے امور کی انجام دہی کی فکر دل و دماغ پر سوار تھی' دشمن قوی سر پر موجود تھا' دور و نزدیک کے اہل حقوق کے حق کا ان تک پہنچانا واجب و لازم ہو چکا تھا' اس لئے مصلحت وقت یہ ہوئی کہ مسند خلافت پر ایک ایسا مرد قوی دل' بلند ہمت لایا جائے جو ان جھمیلوں اور بکھیڑوں سے گھبرائے اور اکتائے نہیں' جو ملامت گروں کی ملامت سے' جو ایسی ریاست گیری کے لوازم میں سے ہے' خصوصاً ایسے زمانے میں کہ ہر کس و ناکس کو بات کرنے کی مجال ہو' کمر ہمت نہ کھول دے' اور اس کار خلافت کے انتظام اور کارزار جنگ و جہاد کے اہتمام کیلئے پوری مستعدی سے کھڑا ہو' صحابہ کرامؓ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اس کمال کے ساتھ بدرجہ کمال موصوف دیکھا' اس کے ساتھ ساتھ دوسرے دلائل نقل بھی ان کی افضلیت پر گواہ تھے' اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی نصوص کی فرمانبرداری کی بنا پر' نیز خود اپنی فراست سے ان کی ولی عہدی کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ ان وجوہ سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان سے بیعت کی طرف ہاتھ بڑھایا' اور سران کے حلقہ اطاعت میں دے دیا'

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے تو جیسا کہ چاہئے تھا' اس کام کی انجام دہی میں مشغول رہے۔

۲۸- زمانہ ابھی تک اسی روش پر تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مدت خلافت پوری ہو گئی' اور شام و فارس کے سرکشوں کی سرکوبی کی مہم ناتمام رہ گئی' چونکہ کوئی نیا سانحہ' کہ جس کی رعایت کمال مرتضوی کی محتاج ہو' ابھی پیش نہیں آیا تھا' بلکہ اسی کار فاروقی کا اہتمام کارکنان خلافت کے پیش نظر تھا' اور اس طرف انتظام مہمات میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی روش ہر عام و خاص کے اس طرح ذہن نشین تھی کہ ان میں سے ہر شخص اس کام کے کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس لئے صحابہؓ نے سب کو امر خلافت میں متساوی دیکھا' الغرض اس موقع پر مسند خلافت پر کسی خلیفہ کے بٹھانے میں سخت تحیر پیش آیا' مگر دانش فاروقی کا کمال دیکھو کہ کس طرح اشارہ نبویؐ پر چلے' اور کس طرح قاعدۂ استخلاف کی رعایت فرمائی' یعنی اسی کمال قرب کو مرجح قرار دیا' اور ان چھ حضرات میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنانے کی وصیت فرمائی جو بارگاہ نبویؐ کے پسندیدہ اور درگاہ الٰہی کے نہایت مقرب تھے' آخر کار ان چھ حضرات میں سے باقیوں کے انکار کی وجہ سے امر خلافت حضرت ذوالنورین اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان دائر ہوا' بعض اکابر صحابہؓ' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارات اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت کو سمجھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تعین میں بھی اسی فاروقی روش پر چلے' اور ان کی افضلیت و اقربیت کا لحاظ کرتے ہوئے' جو خصوصی قرب کو مستلزم ہے' اور جو اکثر نصوص اور زمانہ نبویؐ کے معاملات سے مستنبط ہوتی ہے' نیز اکثر حضرات کے میلان خاطر کا لحاظ کرتے ہوئے' جو کہ بعض احادیث قدسیہ کے موافق افضلیت کی ایک دلیل ہے' صحابہؓ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت امیر رضی اللہ عنہ پر ترجیح دی۔ یہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد

کے معنی معلوم ہو جاتے ہیں جو حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو خطاب کرکے فرمایا تھا کہ:

إن قمصك الله قميصا فلا تخلعه.

(مشکوۃ ص ۵۶۲۔ بروایت ترمذی عن عائشہؓ بلفظ متقارب)

"اگر اللہ تعالیٰ تمہیں قمیص پہنائیں تو اس کو اتارنا نہیں۔"

اور اس "قمیص پہنانے" کو حق تعالیٰ شانہ کی جانب منسوب کرنے کی وجہ بھی معلوم ہوئی' کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت کا پہنچنا محض عطائے خداوندی ہے' جو بغیر خیال و گمان کے پہنچی۔ باقی خلفائے ثلثہ کی خلافتوں کی طرح کمال مخصوص کا اس میں دخل نہیں' اور جو نعمت کہ کسی سابقہ عمل و کمال کے بغیر پہنچے دستور یہ ہے کہ اسے حق تعالیٰ شانہ کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں' اور کہا کرتے ہیں کہ یہ عطیۂ خداوندی ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جو خلیفہ مقرر کیا اس کی کیا وجہ تھی؟ اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد کسی کو مقرر نہیں کیا اس کا کیا سبب تھا؟ اور ارشاد نبوی **ولا اراکم فاعلین** کے معنی بھی اس واقعہ پر خوب منطبق ہو گئے۔ اس لئے کہ پہلی دو بار میں تو خلیفہ اول و ثانی کے استحقاق میں کسی کو کلام نہیں تھا کہ خلافت نبوت کی ضروریات میں خود یکتائے زمانہ تھے' اور ان کمالات کے سبب' جو ان کی خلافت کے مناسب تھے' کوئی شخص ان کے ہم سنگ نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر خلیفہ ثانی کی وفات کے بعد' خصوصاً جبکہ امر خلافت حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان دائر ہوا' ان دونوں اکابر میں ہر ایک کے تقرر کا احتمال تھا' اور یہ دونوں بزرگ بظاہر ایک دوسرے کے ہم سنگ تھے' اگر دونوں کے درمیان فرق بھی تھا تو اس قدر خفی تھا کہ اکابر صحابہؓ بھی' باوجود اس قدر فہم و فراست کے' دیر کے بعد اسے سمجھے' جیسا کہ معلوم ہے۔

پس گویا خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچ کر واپس لوٹ گئی۔

۲۹۔ نیز متذکرہ بالا دو کمالات کی رعایت خلیفہ اول و ثانی کے استخلاف سے عمل میں آچکی تھی، اور اس سے فراغت ہو چکی تھی، اب صرف کمال مرتضوی کی رعایت باقی تھی، تاکہ اول و ثانی کے کمال کی رعایت سے مل کر تمثال نبوت محمدی (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ و سلام) کا نقش ظہور پذیر ہو، مگر چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حیا میں سب سے زیادہ قدم راسخ رکھتے تھے، اور حیا کی نیرنگیوں میں سے یہ بھی ہے کہ بسا اوقات ایک کمزور آدمی سے بڑے بڑے کام ایسی چستی و چالاکی سے ظہور میں آتے ہیں کہ مرد قوی ہمت بھی ان پر رشک کرتا ہے۔ اس جہت سے کمالات عثمانی، کمالات فاروقی کے ساتھ ملحق ہو گئے تھے، اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تقرر بمنزلہ جبر نقصان و تکمیل ناتمام ہوا، یہ نہیں کہ ان کی خلافت باقی تین خلافتوں کی طرح جداگانہ شان رکھتی ہو، پس اس جہت سے، نیز اس امر کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ غضب اور حیا، ہمت کے عظیم ترین مددگار ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں اگرچہ غضب فی اللہ بدرجہ کمال تھا، مگر حیا میں سبقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے، لہٰذا اگر ان کی خلافت کو خلافتِ فاروقی کا تتمہ قرار دیا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔

۳۰۔ حدیث مذکور میں حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا ذکر نہ آنے کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت کا جو خدشہ بعض سنّیوں کے اوہام کو لاحق ہو سکتا تھا اس مقام میں اس خدشہ سے بھی سینہ پاک ہو گیا، اور تین حضرات کو بطور خاص ذکر کرنے اور حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے ذکر کو ترک کرنے کا خلجان بھی رفع ہو گیا۔ اگرچہ یہ خلجان پہلے بھی بحکم مقدمۂ رابعہ مرتفع تھا۔ وجہ اس کی، جیسا کہ پہلے گزرا، یہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کمالات نبوت میں سے ان کے کسی ایسے کمال پر مبنی نہیں

تھی جو زمانہ کے مناسب حال ہو' بلکہ اس بنا پر تھی کہ وہ اپنے زمانہ میں سب سے افضل تھے' اور کمال حیا کے سبب ان کی قوت عزیمت فی الجملہ قوت ہمت فاروقی کے ساتھ مستلحق تھی' اس بنا پر وہ دیگر اقران و امثال سے مقدم ہو گئے تھے' پھر خلافت کے بعد جو کارنامے ان سے ظہور پذیر ہوئے ان کے ملاحظہ سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جیسی امید تھی واقعی انہوں نے بلادِ فارس اور اطراف شام میں جھاڑو دے کر نامور سرکشوں کے خس و خاشاک سے ان علاقوں کو پاک کر دیا۔

۱۳۱۔ الغرض جب حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے جفاکاروں کے ہاتھ سے شربتِ شہادت نوش فرمایا تو کہنا چاہئے کہ قلوب کی سرزمین میں گمراہی کا بیج بو کر اس کی آبیاری کر دی گئی' اور بدعات کے برگ و بار کے ظہور کا وقت قریب آ پہنچا' اگر یقین نہ آئے تو روافض کے پیدا ہونے اور نواصب کے ظاہر ہونے کے منشا کی تفتیش کرو کہ کیا تھا؟ یہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل نکلے گا' جیسا کہ اپنی جگہ مذکور ہے۔ اس وقت حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا' جو ہادی و مہدی تھے' مسند خلافت پر بیٹھنا عین موزوں وقت پر تھا۔ مگر جن لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے ان کے خون سے اپنے ہاتھ آلودہ کئے تھے اور اس گناہ سے اپنا منہ کالا کیا تھا' جب انہوں نے دیکھا کہ تمام صحابہؓ اس واقعہ ہائلہ کے رونما ہونے سے نہایت حسرت اور غیظ و غضب میں ہیں تو انہیں اپنی جان کی فکر ہوئی' اور انہوں نے دامن مرتضویؓ کے زیر سایہ پناہ لی۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بلوائے عام کی وجہ سے قاتل و غیر قاتل کی شناخت نہیں کر سکتے تھے' جبکہ حدود کے جاری کرنے اور قصاص لینے میں ثبوت کامل درکار ہے۔ نیز ان شورہ پشتوں کے ہاتھ سے ابھی ایک دیرینہ خلافت درہم برہم ہو چکی تھی تو یہ خلافت' جسے ابھی قرار و استوار میسر نہیں آیا تھا' اس کا درہم برہم کر دینا کیا دشوار تھا؟ ان وجوہ سے

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اخذ قصاص میں تامل فرمایا' جو حضرات حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ سے وابستہ اور ان کے طرف دار تھے' انہوں نے اس رنج و صدمہ عظیم میں کچھ نہ سوچا' اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں قاتلین عثمانؓ سے مداہنت اور نرمی برتنے کا گمان کیا' اور جنگ و جدال کے درپے ہوئے۔ اس کی وجہ سے بہت سا غبار ایک دوسرے کے دل پر بیٹھ گیا' اور بہت سے فتنے اٹھے' اور ہوا جو ہوا' یہاں تک کہ کفار سے جہاد اور فتح بلدان کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور غنیمتوں کے آنے کا راستہ بند ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے عنوان میں امانت کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ اس وقت **ولا اراکم فاعلین** کا مضمون پوری طرح منطبق ہوا' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار افسوس' جو **ولا اراکم فاعلین** کے مضمون سے ٹپکتا ہے' اس کی وجہ ظاہر ہو گئی' اور معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا افسوس اگر ہے تو اس وجہ سے ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ جیسے ہادی و مہدی تھے' افسوس ہے کہ انہیں امت کی ہدایت اور بدعات کے مادہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی فرصت میسر نہ آئی' اور آپس کی چپقلش کے سبب عنان ہمت دوسری طرف مڑ گئی' بلکہ بانیان فساد کو اس باہمی انتشار و نزاع میں فرصت ہاتھ لگ گئی' جسے انہوں نے بسا غنیمت سمجھا۔ گویا ان کی آتش بے نور پر غیب سے تیل چھڑک دیا گیا' ورنہ عبداللہ بن سبا کا گروہ اور دیگر اہل بدعت' حروراء کے خارجیوں کی طرح آب تیغ مرتضویؓ سے آتش دوزخ کا ایندھن ہو جاتے' اور قدریہ کو اپنے اقوال باطلہ کے ساتھ لب کشائی کی قدرت میسر نہ آتی۔

۳۲۔ مگر حضرت حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اور حضرات صحابہؓ کی جانفشانیاں اور ان کا اخلاص و انقیاد ایسی چیز نہیں کہ ایک دو خطائے اجتہادی یا تعصب قومیت۔ علی اختلاف الاراء........ کی بناء پر سب کو نظر

انداز کردیا جائے' اور ان حضرات سے جو پختہ وعدے ہوچکے ہیں۔ مثلاً (حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے):

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (آل عمران: ٣١)

ترجمہ۔ "آپ فرمادیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کردیں گے۔"

اور (حدیث قدسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ہے):

ومن لقيني بقراب الأرض خطيئة لا يشرك بي شيئاً لقيته بمثلها مغفرة. (مشکوٰة، ص١٩٦)

"جو شخص مجھ سے ملے (یعنی مرنے کے بعد) زمین کی بھرتی کے مطابق گناہ لے کر' بشرطیکہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو' میں اس سے ملوں گا اسی کی مثل مغفرت لے کر۔"

یہ حدیث مشکوٰۃ شریف باب ذکر اللہ عزوجل میں صحیح مسلم سے نقل کی ہے (مشکوٰۃ ص۱۹۶)

الغرض ہمارے لئے کسی طرح روا نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کئے گئے جو وعدے قرآن و حدیث میں مذکور ہیں ان تمام وعدوں کو فراموش کرڈالیں' بلکہ حق تعالیٰ شانہ کی رحمت واسعہ کہ امت نبوی کے تمام صغائر و کبائر اس کے ایک گوشہ میں سماتے ہیں' اس کی قدر شناسی کا تقاضا یہ ہے کہ حسب وعدہ:

﴿أُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾. (الفرقان:۷۰)

"تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا۔"

اگر بالفرض ان اکابر سے دیدہ و دانستہ کبائر بھی سرزد ہوئے ہوں تو دفتر حسنات میں لکھے جائیں' اس بنا پر حکمت لم یزل نے ان واقعات کو رونما فرمایا' کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قدر و منزلت اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ و سلم کی صحبت کے شرف و مرتبہ کا سب کے سامنے اظہار کرنا اور بے ادبوں کو ان کے ٹھکانے پہنچانا اسی پر موقوف تھا۔

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمین،

بعد ازیں گزارش ہے کہ بسبب کم فرصتی و قلت استعداد اور کتابوں کے ساتھ اشتغال نہ ہونے کی وجہ سے امر سامی کی تعمیل میں تاخیر ہوئی' وقت بے وقت کبھی ایک دو گھڑی کی فرصت میسر آئی تو کاغذ سیاہ کرتا رہا' دیر کے بعد جو نوبت یہاں تک پہنچی تو اپنی تقریر پریشان و خامی بیان سے یوں سمجھتا ہوں کہ نظر گرامی میں بے مغز دکھائی دے گی' اور جناب کے فہم رسا کی میزان میں کم وزن ثابت ہوگی۔ مگر ہر شخص اپنے اندازے کے مطابق بات کیا کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں اس کام کا آدمی نہیں ہوں' اس لئے معذور ہوں۔ باقی بخدمت عنایت فرمائے من مولوی عبدالقادر سلام مسنون قبول ہو۔

○ ○ ○

الحمدللہ کہ آج بتاریخ ۴/ ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ کو ترجمہ کی تکمیل ہوئی۔ والحمدللہ اولاً و آخراً۔

سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون' وسلام علی المرسلین' والحمدللہ رب العالمین۔

محمد یوسف لدھیانوی